مطبوعات مجلس ۲

عصر جدید کا چیلنج

اور

اس کا جواب

کا

ی

طلبائے دارالعلوم دیوبند سے خطاب

ملنے کا پتہ:- قاری سید رشید الحسن خطیب جامع

مجلس نشریات اسلام کراچی

مطبوعات مجلس
۲

عصر جدید کا چیلنج

اور

اس کا جواب

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

کا

طلبائے دارالعلوم دیوبند سے خطاب

ملنے کا پتہ :- قاری سید رشید الحسن خطیب جامع مسجد نیو ٹاؤن کراچی

مجلس نشریات اسلام کراچی

مطبوعہ

ایجوکیشنل پریس۔ پاکستان چوک کراچی

پیش لفظ ۵
دیرینہ اور عزیزانہ روابط ۹
دارالعلوم دیوبند کے قیام کا اصل محرک، حمیت دینی ۱۱
مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم کے خطرے کا مقابلہ ۱۲
صحیح میدانِ عمل کا انتخاب ۱۲
مولانا محمد قاسم صاحب کا اصل امتیاز ۱۴
غیر منقطع رشتہ اور ناقابل شکست عہد۔ ۱۸
نیا زمانہ، نئے فتنے۔ ۱۹
عہد جدید کا فتنۂ کبریٰ ۲۰
دینی بدعات اور منکرات سے برد آزما ہونے والوں کے اخلاق کی ذمہ داری ۲۳
موجودہ انقلاب کی برق رفتاری و ہمہ گیری ۲۵
جمہوریت و حکومت کے دائرہ کی وسعت ۲۵
اندرونی خطرہ۔ ۲۷

تعیین و وضاحت اسلام کا امتیاز۔ ۲۷
وحدتِ ادیان نہیں، وحدتِ حق ۲۸
دو حقیقت بیں آنکھیں ۲۹
اصلاح و تجدید کی تاریخ میں افراد کا مقام اور کام ۳۰
مجدد صاحبؒ اور شاہ ولی اللہؒ کا کارنامہ ۳۰
دیوبند کے طلبہ کی ذمہ داری ۳۱
نازک ترین دور ۳۳
زمانہ کے ابوالفضل و فیضی۔ ۳۳
الحاد و تشکیک کے نئے دروازے۔ ۳۳
حقیقت پسندانہ جائزہ اور وسیع تیاری۔ ۳۴
مذہب کا مغربی تصور اور اس کا فتنہ۔ ۳۵
دیوبند کے فضلاء کتنے مؤثر اور کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ۳۶
ذہن و کردار کی تعمیر۔ ۳۶
موجودہ عہد کی عام ضمیر فروشی۔ ۳۷
نئی قیادت کی ضرورت۔ ۳۸
حقیقت شناسی اور خود شناسی۔ ۳۹

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

پیش لفظ

اگست ۱۹۷۲ء کے دوسرے ہفتے (۱، ۲، ۳ رجب ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۲، ۱۳، ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء) میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے جلسے ہوئے مجھے مسلسل کئی سال کے بعد ان جلسوں میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ اس موقعہ پر دارالعلوم کے طلبائے عزیز نے تقریر کی فرمائش کی اور اس کے لئے سخت اصرار کیا، ان کی اس فرمائش میں اہتمام اور ذمہ داروں کا ایما بھی شامل تھا، میرا انکار، اور اضمحلال طبع کا عذر ان کے اصرار پر غالب نہ آسکا، اور میں نے شاعر حکیم کے اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے کہ ؎

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن

ان کے سامنے ہتھیار ڈالدیئے، اور ۱۲؍اگست کو ۱۰½ بجے شب میں دارالحدیث کے وسیع ہال میں طلبہ سے یہ خطاب کیا، جواب رسالہ کی شکل میں قارئین کے سامنے ہے، جلسہ کی صدارت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار واڑیسہ نے فرمائی۔ جلسہ میں متعدد ارکان شوریٰ بڑے اساتذہ، اور اہتمام کے متعدد ذمہ دار شریک تھے، طلبہ بہت بڑی تعداد میں موجود تھے، تقریر ٹیپ کرلی گئی تھی اس کو بڑی محنت سے مولوی واحد فیاض جلال پوری و مولوی محمد شعیب خاں کوٹی وغیرہ نے ٹیپ سے قلم بند اور مرتب کیا، مقرر نے اس پر تفصیل کے ساتھ نظر ثانی کی، حسب ضرورت ترمیم و تشریح سے بھی کام لیا، اور ذیلی عنوانات قائم کئے جس سے یہ برجستہ تقریر منقح و مرتب ہوگئی، اور ان لوگوں کے لئے جو اس جلسہ میں شریک نہیں تھے، زیادہ مفید اور قابل فہم ہوگئی۔

چونکہ اس تقریر میں بہت سے ایسے حقائق اور مفید و عمیق اشارات آگئے ہیں جو عام طور پر تقریر و تحریر میں نہیں آتے، اور جو طلبائے مدارس دینیہ کے لئے بالخصوص اور حساس اور باحمیت مسلمانوں کے لئے بالعموم مفید ہیں۔ اس لئے اس کو کتابچہ کی شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ عام طور پر وہ دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائیگا، اللہ تعالیٰ اس سے کہنے والے، سننے والوں اور پڑھنے والوں کو فائدہ پہونچائے، اور اس سے وہ دینی حمیت بیدار اور

خدمت دین کا جذبہ متحرک ہو جو اس سب عرض و معروض کا مقصد اصلی ہے۔

راقم ان سب عزیز طلبہ کا عمومیت کے ساتھ اور مولوی ہلال احمد صاحب عثمانی کا خصوصیت کے ساتھ شکر گزار ہے جنھوں نے اس سلسلہ میں خصوصی دلچسپی لی، اور اس کی تحریر و ترتیب کا اہتمام کیا نیز بزم مذاکرات کے ارکان بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔ جنھوں نے جلسہ کے انعقاد اور تقریر کی ترتیب میں خاص حصہ لیا۔

ابو الحسن علی ندوی
دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

یکم شعبان المعظم ۱۳۹۲ھ ۱۰ ستمبر ۱۹۷۲ء

(خطبۂ مسنونہ اور حمد و صلوٰۃ کے بعد)

جناب صدر! عزیز طلبہ!

دیرینہ و عزیزانہ روابط

دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کے سامنے کچھ عرض کرنا عزت و مسرت کی بات بھی ہے، اور ذمہ داری و مسئولیت کی بھی!..... مجھے مختلف اداروں اور دانش گاہوں یونیورسٹیوں سے لے کر عربی مدارس تک کے طلبہ سے عرض معروض کرنے کا موقعہ ملا ہے، لیکن بلا تکلف عرض کرتا ہوں کہ مجھے آپ کے سامنے کچھ کہنے میں بڑی ذمہ داری محسوس ہوتی ہے میں اس اعزاز و اعتماد کی جس کا آپ نے اظہار کیا ہے، قدر کرتا ہوں، میں خدا کے سامنے سجدہ ریز، اور ثنا خواں ہوں کہ جو کبھی یہاں طالب علم کی حیثیت سے حاضر ہوتا تھا اور اپنے لئے اس کو بڑی سعادت کی بات سمجھتا تھا، اس کو اس وقت خطاب کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے، ابھی شاید یہ وفا شعار، اور درد آشنا، سرزمین مجھے بھولی نہ ہوگی، میں اس سعادت و توفیق پر بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدۂ شکر

ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے یہاں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کی زندگی میں طالب علمانہ، اور نیازمندانہ حاضری، اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی، میں اس کو اپنے لئے سرمایۂ سعادت سمجھتا ہوں، اور اس سے اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی امیدیں رکھتا ہوں۔

میں اس بات پر جتنا فخر کروں کم ہے، لیکن میری نیازمندی کی تاریخ اس سے زیادہ وسیع اور طویل ہے، کئی پشتوں سے میرا تعلق اس درسگاہ عالی مقام سے رہا ہے، یہاں کی زندگی ان لوگوں کے آنسوؤں سے نم، اور یہاں کی فضا ان کی دعاؤں اور آہوں سے اب بھی معطر ہوگی، جو قافلہ[1] بنا کر اس سرزمین سے گذرے۔

مجھے اس اعزاز اور اس ذمہ داری دونوں کا احساس ہے لیکن میں اپنے آپ کو آپ سے الگ نہیں سمجھتا، میں پہلے بھی طالب علم تھا، اب بھی طالب علم ہوں، اور طالب علم ہی رہنا چاہتا ہوں میری زندگی علم اور طالبان علم کے ساتھ وابستہ کردی گئی ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ یہ سلسلہ ہمیشہ قائم رہے، میں آپ سے انھیں الفاظ میں جو کبھی زبان نبوت سے حضرات انصار، اور اہل مدینہ کے لئے نکلے تھے کہہ سکتا ہوں کہ:-

المحیا محیاکم، والممات   جینا بھی تمہارے ساتھ ہے، اور مرنا بھی

---

[1] اشارہ حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء (مولانا اسماعیل شہیدؒ اور مولانا عبدالحیٔ صاحب وغیرہم) کی طرف ہے جن کا کئی روز اس قصبہ میں قیام رہا (ملاحظہ ہو سیرت سید احمد شہیدؒ جلد اول باب دوآبہ کا دورہ")

مماتکم تمہارے ساتھ۔

خدا میری یہ دعا، اور آرزو پوری کرے۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کا اصل محرک، حمیت دینی

طلبائے عزیز! آپ دارالعلوم دیوبند کے طالب علم ہیں، میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ آپ کی درسگاہ کی بنیاد کس چیز پر پڑی؟ آپ کی درسگاہ کا طرۂ امتیاز کیا ہے؟۔ یقیناً آپ کے پاس اس کے لئے بڑے بڑے معقول اور ناقابل تردید جوابات ہوں گے آپ اگر کہیں، کہ علم پر اس کی بنیاد پڑی، تو کون اس کا انکار کرسکتا ہے؟ آپ اگر کہیں کہ اخلاص پر اس کی بنیاد پڑی تو کون اس کی تردید کرسکتا ہے؟ اگر آپ کہیں کہ احیار سنت اور مخالفت بدعت پر، یا علم حدیث کی ایک خاص طرز کی خدمت پر اس کی بنیاد پڑی تو اس میں بھی کسی اختلاف کی گنجائش نہیں، یہ ساری چیزیں قابل صد احترام ہیں، اور ان پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔ لیکن یہ وہ چیزیں ہیں، جن میں ہندوستان کے اکثر دینی مدارس دارالعلوم کے شریک ہیں، مرتبہ و مقام کا فرق ضرور ہوگا، لیکن مدارس عربیہ کی بنیاد عام طور پر انھیں مقاصد پر رکھی گئی ہے، انھیں کی طرف ان کا انتساب ہے اور یہی ان کی قدر و قیمت ہے۔

لیکن جس امتیاز پر آپ کے مدرسہ کی بنیاد پڑی، اور جو اس کا حقیقی سنگِ بنیاد ہے، وہ سنگِ بنیاد نہیں جو اہل ثروت، اور اہل وجاہت سے رکھوایا جاتا ہے، اور

جس کے لئے بڑے بڑے جلسے، اور تقریبیں منعقد کی جاتی ہیں) وہ دین کی حمیت اور اسلام کی حفاظت کا جذبہ تھا، یہ ہے اس دار العلوم کا سب سے بڑا طرۂ امتیاز۔

مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم کے خطرے کا مقابلہ

اس وقت جبکہ ہندوستان پر ایک نئی تہذیب کا حملہ، اور یہاں ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا تھا، اس وقت اس دار العلوم کی بنیاد پڑی، دار العلوم کی بنیاد درحقیقت اس احساس پر تھی کہ اب ہندوستان میں جو دور آنے والا ہے، وہ ایمان بالغیب کا دور نہیں ہوگا، وہ دور محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "دانائے سُبل ختم الرسل مولائے کل"[1] سمجھنے کا دور نہیں ہوگا، اس دور کی بنیاد ختم نبوت، اور اس عقیدہ پر نہیں ہوگی کہ آپ آخری پیغمبر، اور آپ کی شریعت آخری شریعت ہے، بلکہ اب جو دور شروع ہو رہا ہے، اس کی بنیاد مادی زندگی کو اصل ماننے اور محسوسات وظواہر کی پرستش پر ہوگی۔

صحیح میدان عمل کا انتخاب

اس وقت جبکہ سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہو گیا تھا، اس وقت کے روشن ضمیر

---

[1] اشارہ اقبال کے اس شعر کی طرف ہے ؎

وہ دانائے سُبل ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا

علماء نے اس حقیقت کو سمجھا کہ اس دم توڑتی ہوئی قوت میں جان ڈالنے میں اپنا وقت صرف کرنا، اور اس ٹمٹماتے چراغ کو جس کا تیل ختم ہو گیا ہے، اور بتی جل گئی ہے دوبارہ بھڑکانا نہ صرف مشکل، بلکہ لاحاصل کام ہے، اس لئے کہ کسی ایسے خشک درخت کو جو زندگی کی صلاحیت سے محروم، اور اس کا نمو ختم ہو چکا ہے، کسی "ہرالے" سے چھڑکاؤ کر کے اور کسی خارجی تدبیر سے شاداب، اور قائم نہیں رکھا جا سکتا، گویا ان کے سامنے فلسفی مورخ ابن خلدون کا حکیمانہ مقولہ تھا کہ "ان الھرم اذا نزل بالدولۃ لا یرتفع" (جب کوئی سلطنت بوڑھی اور از کار رفتہ ہو جاتی ہے تو پھر اس کو از سر نو جوان نہیں کیا جا سکتا) وہ یہ سمجھتے تھے کہ کوئی بڑی سے بڑی مسیحائی کسی جاں بہ لب ادارہ کو جو اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا ہے، زندہ نہیں رکھ سکتی انھوں نے اپنی صلاحیتوں اور وسائل کا دیانتدارانہ اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیا اور اپنی طاقتوں کو سوچ سمجھ کر اسلامی تہذیب، اور اسلامی علوم کی حفاظت کے مقصد پر مرکوز کر دیا ان کو یقین تھا کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ زندگی کا جو آئین دیا گیا ہے، اور جو کتاب عطا کی گئی ہے، جو قانونِ شریعت ملا ہے، ہمیں جس تہذیب کا وارث بنایا گیا ہے ہمیں جو محکمات اور اصول عطا کئے گئے ہیں، ان کیلئے بہار و خزاں، جوانی اور بڑھاپے، ترقی و تنزل تغیر و تبدل اور موت و حیات کا یہ قانونِ طبعی نہیں، جو ساری کائنات میں کارفرما ہے۔

لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ   (اس پر جھوٹ کا دخل نہ آگے سے ہو سکتا ہے
وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِیْلٌ مِّنْ   اور نہ پیچھے سے (اور) دانا (اور) خوبیوں

حَكِيمٍ حَمِيدٍ (سورۂ حم سجدہ ۔۴۲) والے (خدا) کی اتاری ہوئی ہے)

اس کی حقیقت ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (سورۃ المائدہ ۔۳) آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا۔

اس کے دوام اور بقاء کی ضمانت اور اعلان ہے، انھوں نے ساری طاقت علوم اسلامیہ کی حفاظت اور اس تہذیب کو نہ صرف اپنی جگہ برقرار رکھنے بلکہ اس کے دائرہ کو وسیع کرنے اور زندگی سے اس کا ربط قائم رکھنے پر صرف کر دی، توفیق الٰہی کی یہ خاص یاوری اور دستگیری تھی کہ انھوں نے اپنی جدوجہد کے لئے صحیح میدان کا انتخاب کیا، یہاں پر ایک لغزش سیکڑوں برس پیچھے ڈال سکتی تھی۔ اور پھر کبھی اس کی تلافی نہیں ہو سکتی تھی۔

مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا اصل امتیاز

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتوی، اور ان کے عالی مقام رفقاء حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ وغیرہ کے اندر جو جذبہ کارفرما تھا، وہ حمیت اسلامی کا جذبہ تھا، اسی نے ان سے اس دارالعلوم کی بنیاد رکھوائی، مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو دینی علوم میں اجتہاد کا مقام حاصل تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو علم کلام اور معارف الٰہیہ میں

دیدہ وری، اور نکتہ سنجی کی غیر معمولی دولت سے نوازا تھا جس کی شاہد ان کی کتابیں "آب حیات"، تقریر دل پذیر" اور "حجۃ الاسلام" ہیں۔ لیکن ان کا سب سے بڑا امتیاز یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حمیت اسلامی کے جوہر سے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا اور اللہ نے انکو ایک بے چین روح، اور ایک مضطرب دل عطا فرمایا تھا' وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان جس پر ہمارے اسلاف کی بہترین صلاحیتیں صرف ہوئی ہیں اور جس نے اسلام کی خدمت اور دینی علوم کے میدان میں وہ کارنمایاں انجام دیئے جن کی نظیر بڑے بڑے اسلامی ملک نہیں پیش کر سکتے۔ تاریخ کے پچھلے دور میں وہ مسلمانوں کی ذہانت آئی قوت اجتہادی، ان کی اولوالعزمی، اور حوصلہ مندی کے اظہار کا سب سے بڑا میدان رہا ہے، اس نے علوم اسلامیہ کی خدمت میں حصہ ہی نہیں لیا۔ بلکہ ان میں اضافہ کیا ہے، اس نے اسلامی کتب خانوں کو بعض وہ کتابیں دیں، جن کی مثال اسلام کی پوری علمی تاریخ میں نہیں ملتی، کیا اس وسیع ملک کو اس آسانی کے ساتھ مغربی تہذیب کی تحویل، اور اس کے علم برداروں کے چارج میں دیدیا جائے؟ کیا ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ مسلمان خاندانوں کے نونہال صدیقی، فاروقی، علوی، عثمانی، اور سادات وشیوخ کے گھرانوں کے چشم وچراغ جن کے اسلاف کرام کی کوششوں کی بدولت لاکھوں انسانوں کو اسلام کی ہدایت، اور علم کی دولت نصیب ہوئی، جنھوں نے اسلام کے چراغ کو اپنے سینے سے لگائے رکھا، اور بڑی بڑی آندھیوں اور طوفانوں میں بھی اس کو گل ہونے نہ دیا۔

اسلامی تہذیب و معاشرت، اور سنت و شریعت سے رشتہ توڑ کر خالص مادہ پرست انگریزوں کے قبضے میں چلے جائیں، اور وہ ان کو اپنی نئی تہذیب و تعلیم کے سانچہ میں ڈھال کر مسلمانوں، یا صحیح الفاظ میں دنیا داروں کی ایک نئی نسل تیار کریں جس کو نام اور قومیت کے سوا کسی چیز میں سابق نسل سے کوئی مناسبت اور مشابہت نہ ہو؟۔

یہ سوال تھا جو مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے سامنے ایک مسئلہ بن کر کھڑا ہو گیا یہ مسئلہ محض ایک مدرسہ اور تعلیم گاہ کے قیام کا نہیں تھا، میں سمجھتا ہوں کہ دارالعلوم دیوبند کے حق میں "ازالۂ حیثیت عرفی" کا جرم ہوگا، اگر کہا جائے کہ دارالعلوم چند مخصوص کتابوں کے پڑھنے پڑھانے، اور درس و تدریس کے ایک مرکز کی حیثیت سے قائم ہوا تھا، اس سے بڑھ کر اس کے بانیوں کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہو سکتی، ایسا کہنے والوں کو ان بزرگوں کی روحوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑیگا، جس وقت یہ کہا جاتا تھا کہ یہ محض ایک مدرسہ ہے، تو حضرت شیخ الہند تڑپ اٹھتے تھے، ان کے نزدیک یہ اسلام کا ایک قلعہ، اس کے داعیوں اور مجاہدوں کی تربیت کی ایک چھاؤنی، اور سلطنت مغلیہ کے گل ہوتے والے چراغ کا بدل، بلکہ نعم البدل تھا۔

بس مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے سامنے اصل مسئلہ یہی تھا کہ کیا ہندوستان کو ان مغربی غارتگروں کے ہاتھ میں دیدیا جائے؟ کیا ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے

نہیں کہ ہمارے جگر کے ٹکڑے، جنھوں نے ہمارے خون جگر سے پرورش پائی، جن کی رگوں میں علماء اور اولیاء کا خون دوڑ رہا ہے، ان کالجوں اور یونیورسٹیوں کے قبضے میں چلے جائیں اور مغربی تہذیب اور تعلیم کے سائے میں پروان چڑھ کر، اور ہم سے مکمل طور پر بیگانہ و نا آشنا ہو کر نکلیں؟ انھوں نے انگریزی حکومت کے اس چیلنج کو قبول کیا، اور بالکل اپنے جد امجد صدیق اکبرؓ کی زبان میں یہ کہا کہ:-

أینقص الدین وأنا حی؟ کیا خدا کے دین میں میرے جیتے جی کتر بیونت کی جا سکتی ہے؟

ان کی صحیح ترجمانی یہی فقرہ کرتا ہے، جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے حضرت ابو بکرؓ کی زبان سے نکلا تھا، اس فقرہ نے تاریخ کے دھارے کو بدل دیا، اور زمانہ کی کلائی موڑ دی تھی، یہ ایک مختصر سا فقرہ نہیں، ایک دور کا عنوان اور ایک تاریخ کا خلاصہ ہے، اگر صدیق اکبر کی کوئی سیرت و سوانح نہ لکھی جاتی، تو یہی ایک فقرہ ان کی مکمل سیرت و سوانح بن سکتا تھا، یہ ایک الہامی فقرہ تھا، جو ان کی زبان سے نکلا- ایک شیر تڑپ کر جست لگا کر دھاڑتا ہے، جس سے سارا جنگل کانپ جاتا ہے، اس سے زیادہ جلال و صولت اور اس سے زیادہ شجاعت و غیرت اس فقرہ میں ہے، میں سمجھتا ہوں کہ دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کے بانیوں کی جو چیز رہنمائی کر رہی تھی، وہ یہی احساس تھا، ان کا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا کہ وہ صرف و نحو کی تعلیم اور علوم عالیہ و آلیہ کی مجرد تدریس کے لئے مرکز قائم کریں، اس کیلئے مصر کا جامع ازہر، تیونس کا جامع زیتونہ، مراکش کا جامع

القرویین اور ہندوستان کے کئی بڑے بڑے مدارس موجود تھے، انکی ٹکر کا کوئی مدرسہ قائم کرنا اس بے سروسامانی کی حالت میں محض تعلیم و تعلم کیلئے کوئی دانشمندانہ فعل اور کوئی جرأت مندانہ اقدام نہ تھا۔

غیر منقطع رشتہ اور ناقابل شکست عہد

یہی دینی حمیت تھی جس نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو بے چین بنا رکھا تھا اور انھوں نے مدرسہ قائم کیا، اس مدرسہ نے ایک بہت محدود اور غیر محسوس طریقہ پر کام کا آغاز کیا جس کا احساس اس زمانہ کے اچھے اچھے صاحب نظر لوگوں کو بھی شاید نہ ہوا ہو لیکن اس کا مقصد بہت عظیم تھا، وہ مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب، اسلامی معاشرت، علوم دینیہ اور شریعت اسلامیہ کیلئے ایک قلعہ تعمیر کریں، اور اس دعوت کو متعدی بنائیں۔

وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ — اور یہی بات اپنی اولاد میں پیچھے چھوڑ گئے
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (الزخرف ۲۸) — تاکہ (خدا کی طرف) رجوع کریں۔

انکی ان تمام کوششوں کا ماحصل اور مطمح نظر صرف یہ تھا، کہ اس ملک کے مسلمان جبتک زندہ رہیں، ان کا رشتہ ملت ابراہیمی، اور شریعت محمدی سے استوار رہے، وہ اسی دین و آئین کے پابند ہوں جو خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ذریعہ سے ان کو ملا ہے، اور جب وہ دنیا سے رخصت ہوں تو وہ اسی دین کے

وفادار اور حلقہ بگوش ہوں، یہ گویا اسی وصیت اور عہد نامہ کی تعمیل تھی، جس کا قرآن شریف میں تذکرہ ہے۔

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهِيْمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ

(سورۃ البقرہ-۱۳۲)

اور ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اسی بات کی وصیت کی اور یعقوب نے بھی (اپنے فرزندوں سے یہی کہا) کہ بچو خدا نے تمہارے لئے اسی دین کو پسند فرمایا ہے تم مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔

نیا زمانہ، نئے فتنے

عزیزان گرامی! آپکی درسگاہ کی بنیاد حمیت اسلامی پر پڑی۔ آپ کی درسگاہ کی بنیاد زمانہ کے چیلنج کے قبول کر لینے پر پڑی، اب زمانہ کے نئے چیلنج کو آپ نظر انداز نہیں کر سکتے، کم سے کم دارالعلوم دیوبند، اور ندوۃ العلماء کے لئے اس چیلنج کو نظر انداز کرنے کا کوئی جواز نہیں، اس لئے کہ انکی بنیاد ہی زمانہ کے چیلنج کو قبول کرتے پر پڑی تھی، مغربی تہذیب اور معاشرت اور انگریزی تعلیم جس کے ساتھ کسی قسم کی مذہبی رہنمائی، اور اخلاقی تعلیم و تربیت کا انتظام نہیں تھا، اس زمانہ کا فتنہ تھا۔

لیکن فتنے کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں، اور ایک ہی فتنہ ہمیشہ نہیں ہوتا

نئے نئے فتنے سر اٹھاتے ہیں، اور اسلام اور مسلمانوں کے لئے نئے نئے خطرے سامنے آتے ہیں، جاہلیت نئے نئے روپ میں سامنے آتی ہے۔ اور بڑے دم خم کیساتھ میدان میں اترتی ہے، اقبال نے غلط نہیں کہا تھا ؎

اگرچہ پیر ہے مؤمن جواں ہیں لات و منات

بڑی خطرناک بات ہے کہ لات و منات یعنی باطل طاقتیں اور جاہلیت قدیم تو زندگی اور جوش و خروش سے بھرپور ہوں، اور مؤمن میں جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا وارث اور نائب ہے، کہنگی اور فرسودگی، پستی اور افسردگی، کنارہ کشی اور پسپائی کی ذہنیت پیدا ہو جائے، لات و منات نئے دم خم کے ساتھ، نئی امنگوں اور ولولوں کے ساتھ نئی تیاریوں اور نئے طریقوں کے ساتھ، نئے نعروں اور نئی للکاروں کے ساتھ میدان میں آئیں اور مؤمن پر موت کی نیند طاری ہو جائے، اس کے قویٰ میں افسردگی، اور اضمحلال پیدا ہو جائے، وہ زندگی کے میدان سے فرار اختیار کرکے یا کنارہ کش ہو کر کسی گوشۂ عافیت کو تلاش کرے، جہاں وہ اپنی زندگی کے دن گذار سکے، اور لات و منات خم ٹھونک کر میدان میں کھڑے ہوں، اور دعوت مبارزت دے رہے ہوں۔

عہد جدید کا فتنۂ کبریٰ

حضرات! اس زمانہ کا فتنہ اور چیلنج کیا ہے؟ اس زمانہ کا چیلنج یہ ہے کہ

اسلام کو اس کی جداگانہ تہذیب، اس کی مخصوص معاشرت، اس کے عائلی قانون اس کے نظام تعلیم، اس کے زبان و ادب، اور رسم الخط، اور اس کے پورے ورثہ سے الگ کر دیا جائے، اور اسلام چند عبادات، اور چند رسوم و تقریبات کا (جو بعض مذاہب کا کل سرمایہ، اور بعض قوموں کا واحد مذہبی نشان ہے) مثلاً شادی اور غمی میں کیا ہونا چاہئے، مردے کو کس طرح آخری مرحلہ سے گذارا جائے وغیرہ وغیرہ، بس اسلام انھیں مذہبی و معاشرتی رسوم (RITES) کا مجموعہ بن کر رہ جائے، میں نہیں جانتا کہ کل کیا ہو، لیکن پھر بھی اندازہ ہے کہ شاید ابھی یہ مرحلہ دور ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں سے کہا جائے کہ آپ کو نماز پڑھنے کی اجازت نہیں، آپ کو کوئی خاص عقیدہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں آپ روزہ نہیں رکھ سکتے، آپ زکواۃ نہیں دے سکتے، لیکن وہ مرحلہ ضرور آگیا ہے کہ مسلمانوں سے اشارہ اور کنایہ سے، اور کبھی کبھی صاف کہا جاتا ہے کہ مسلمان اپنی رضا و رغبت سے اپنی جداگانہ تہذیب، اور ہر اس چیز سے بے تعلقی اختیار کریں جو ان میں ایک الگ ملت، اور ایک مستقل تہذیب کا وارث ہونے کا احساس پیدا کرتی ہے، وہ خود ہی اعلان کر دیں کہ ہم کسی جداگانہ تہذیب کے حامل نہیں ہیں، وہ خود اپنے عائلی قانون (پرسنل لا) میں اصلاح و ترمیم کا مطالبہ کریں اور اپنے لئے وہی یکسان قانون پسند کریں جو سارے ملک کیلئے نافذ ہو۔ وہ اپنے تمام تعلیمی مرکزوں کو، جو انھوں نے اپنی پسند و ضرورت کے مطابق قائم کئے تھے، حکومت کی تحویل اور انتظام

یں دیدیں، اوران کے نظم ونسق سے خود دست بردار ہو جائیں، تاکہ ان سے ایک ہی طرح کے ماڈل تیار کئے جائیں، جو اس سیکولر اور اشتمالیت پسند ملک سے ہم آہنگ ہو حکومت اسلام کی مخالف نہیں اور اسکو اسلام کے ختم کرنے کے کام سے کوئی دلچسپی نہیں، اسکو تو اس پر فخر ہے کہ عالم اسلام کی سب سے بڑی مسلم برادری یہاں آباد ہے، اس کو آباد رہنا، اور پھلنا پھولنا چاہئے اس سے بڑے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں، اور بین الاقوامی، اور سیاسی موقعوں پر اس کو ایک دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ آج صاف صاف کہا جا رہا ہے کہ اگر مسلمانوں کو اس ملک میں رہنا ہے، تو ان کو قومی دھارے میں بہنا چاہئے، اور قومی دھارے کے معنی یہ ہیں کہ آپ تمام تشخصات سے دست بردار ہو جائیں۔ آج کا مطالبہ یہ ہے کہ مسلمان رہو، تمہیں کوئی نہیں ٹوکتا یہ فرقہ وارانہ فسادات تو ایک مرض کی ہذیانی کیفیت، اور ہسٹریا کا ایک دورہ ہے جو ہمیشہ نہیں رہے گا، آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ بہت کم ہو گئے ہیں، اور میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ وہ اور بھی کم ہو جائیں گے۔ میرے نزدیک یہ اصل خطرہ نہیں، اصل خطرہ نسل کشی کا نہیں، معنوی ارتداد کا ہے، ذہنی و تہذیبی ارتداد، اس خطرہ کو دیکھنے اور اس کو محسوس کرنے کے لئے کسی بڑی فراست، اور دوربینی کی ضرورت نہیں یہ تو دیوار کا نوشتہ ہے، جس کو ہر ایک پڑھ سکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے جن کو آنکھیں دی ہیں وہ صاف دیکھ رہے ہیں کہ آج علی گڑھ کا معاملہ ہے۔ کل دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کی باری آسکتی ہے۔ وقت اور حالات کا مسئلہ ہے اور اس کا انحصار اس پر

ہے کہ ہم علی گڑھ کے مسئلہ پر کتنی زندگی اور بیداری اور کتنی غیرت، اور خودداری کا ثبوت دیتے ہیں

دینی بدعات، اور منکرات سے نبرد آزما ہونے والوں کے اخلاف کی ذمہ داری۔

عزیز طلبہ! آپکے اسلاف وہ تھے جنھوں نے بدعات کے ساتھ ادنی مصالحت گوارہ نہیں کی، آپکے اسلاف نے آجتک مولود کے قیام کی اجازت نہیں دی، کتنے رسوم اور طریقے ہیں جو مسلمانوں کی زندگی میں داخل ہو گئے ہیں، اور انھوں نے مذہبی فرائض اور دینی شعائر کی حیثیت اختیار کرلی ہے، لیکن آپ کا جس مکتب خیال اور مسلک سے تعلق ہے اس کے علماء نے انکی ہمیشہ مخالفت کی، اور انکو بدعت اور بے اصل بتایا، اس کی انکو معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی، ان کا مقاطعہ کیا گیا، ان کو مسجدوں سے نکالا گیا، ان پر کفر و ضلالت کے فتوے لگائے گئے، وہ بہت سے دنیوی مفادات، اور لذتوں سے محروم رہے، لیکن انھوں نے ان چیزوں کے ساتھ ذرا بھی رواداری نہیں برتی، اور کسی مداہنت اور مصلحت کوشی سے کام نہیں لیا، میرا خود اسی کیمپ سے تعلق ہے، جو شرک و بدعات کے مقابلہ میں سر بکف رہا ہے۔ بلکہ میرا تعلق اس خاندان سے ہے، جو اس سلسلہ میں بہت آگے رہا ہے، اور جو شرک و بدعت کے معاملہ میں زیادہ ذکی الحس واقع ہوا ہے، میرا نسبی و روحانی اور ذہنی تعلق حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ سے ہے، جنھوں نے اس ملک میں احیاء توحید اور سنت کی دعوت کا علم بلند کیا، اور اس کیلئے جان کی بازی لگا دی، اگر میری جرأت معاف

کی جائے تو میں کہوں کہ آپ کے کیمپ میں بھی یہ خیال اور یہ دعوت وحمیت اسی کیمپ سے آئی ہے، اس لئے مجھے یہ پوری تاریخ عزیز ہے، میں اس پورے ورثہ کو سینہ سے، بلکہ آنکھوں سے لگاتا ہوں، نہ اس پر شرمسار ہوں، اور نہ اس سے دست بردار، میری تمام تحریریں میری حقیر کاوشیں اور کوششیں سب اسی ورثہ کی حفاظت اس کی تبلیغ واشاعت اور اس کی بازیافت میں صرف ہوئی ہیں ؎

میں کہ میری نوا میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

میرے کوتاہ قلم نے "دعوت وعزیمت" کی داستان تفصیل سے بیان کی ہے، اور اس موضوع پر ہزاروں صفحات سیاہ کئے ہیں، مجھ پر ان کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے بھی ذمہ داری ہے کہ میں آپ کا احتساب کروں۔

آپ ان اسلاف کے نام لیوا ہیں جنھوں نے دین میں ادنیٰ تحریف اور مسلمانوں کے ادنیٰ انحراف کو برداشت نہیں کیا، آج معاملہ بدعات کا نہیں، آج معاملہ انگریزی تعلیم کا نہیں ہے، آج معاملہ ایک طرف شرک جلی، اصنام پرستی، اور دیولائی عقائد (میتھالوجی) کا ہے، آج معاملہ برہمنی تہذیب اور ہندو معاشرت کے قبول کرنے کا ہے، دوسری طرف آج معاملہ مکمل لادینیت اور کمیونزم کے قبول یا رد کرنے کا ہے، آج معاملہ ایک ایسی قوم کی حیثیت اختیار کرنے کا ہے جس کی ساری وفاداریاں و وابستگیاں اس خاک کے ساتھ ہوں، جن سے ہمارے ظاہری جسم کا خمیر اٹھا ہے اسی کے لئے

جینا اور مرنا ہو، آج کا چیلنج اور آج کا خطرہ پچھلے تمام چیلنجوں اور خطرات سے زیادہ سنگین ہے، اور اس کے قبول کرنے کیلئے کہیں زیادہ ایمان اور استقامت اور کہیں زیادہ ایثار و قربانی کی ضرورت ہے۔

موجودہ انقلاب کی برق رفتاری و ہمہ گیری

پہلے انقلاب بڑی سست رفتاری اور آہستہ خرامی کے ساتھ آتا تھا جیسا زمانہ تھا ویسا ہی انقلاب بھی، وہ بیل گاڑیوں ہاتھیوں اور اونٹوں اور زیادہ سے زیادہ تیز رفتار گھوڑوں کا زمانہ تھا اُس وقت انقلاب انھیں سواریوں کی رفتار سے آتا تھا، پھر ریل چلی انقلاب ریل پر سفر کر کے آنے لگا، ہوائی جہاز چلے انقلاب کی رفتار تیز ہوئی، اب انقلاب ایٹمی انرجی استعمال کرتا ہے آواز سے زیادہ تیز جہازوں اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ دم کے دم میں گھر گھر پہونچ جاتا ہے۔

جمہوریت اور حکومت کے دائرہ کی وسعت۔

آج "سلطانیٔ جمہور" کا زمانہ ہے، ہمارے اوپر پارلیمنٹ کی حکومت ہے اور اسکو آئین سازی کا پورا اختیار، پھر حکومت کا دائرہ پہلے کی طرح دفاع، امن قائم کرنے، اور ٹیکس وصول کرنے تک محدود نہیں، وہ زندگی کے تمام شعبوں اور تعلیم و تربیت کے تمام ذرائع پر حاوی ہے اور گھر اور باہر کی کوئی چیز اس کے دائرہ اختیار سے

خارج نہیں، رات پارلیمنٹ میں ایک قانون پاس ہوجاتا ہے، اور آج سارے ملک میں اس کا نفاذ، اس وقت ہم اور آپ یہاں جمع ہیں، ممکن ہے اس وقت پارلیمنٹ کا کوئی اجلاس ہو رہا ہو وہاں ایک قانون بن جائے، اور ہماری زندگی میں کوئی اہم تبدیلی واقع ہو، آپ کو معلوم ہے کہ پرانی حکومتیں پرائیویٹ معاملات میں دخل نہیں دیتی تھیں، ذاتی ملکیتوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا، آزاد درسگاہوں سے ان کا کوئی سروکار نہیں تھا، آپ جیسے پرسنل لا کہتے ہیں، یعنی شادی، بیاہ، اور ترکے وغیرہ کا قانون، اس سے ان کو کوئی علاقہ نہیں تھا تعلیم میں کسی خاص عقیدے کسی خاص فکر و مقصد پر ان کو اصرار نہ تھا، اب دنیا بدل چکی ہے آپ کو سمجھنا چاہیے کہ آپ کس جگہ بیٹھے ہیں، زمانہ کے انقلاب نے آپ کو اس جگہ پر اچانک لا کھڑا کیا ہے؟ آپ آج اس محدود ماحول میں بہت خوش ہیں، آج آپ کو ہر طرف نورانی شکلیں نظر آتی ہیں، آپ کے کانوں میں، قال اللہ و قال الرسول کے سوا کوئی صدا نہیں پڑتی۔ یہ آپ کا دار الحدیث ہے، وہ دار التفسیر، یہ مسجد کا روحانی ماحول ہے، اور یہ مدرسہ کی علمی فضا، لیکن کل جب آپ یہاں سے جائیں گے، اور کل سے میری مراد یہ نہیں کہ جب آپ فارغ التحصیل ہو کر جائیں گے، بلکہ جب آپ چھٹیوں میں اپنے گھر جائیں گے، تو وہاں آپ کو بہت کچھ دنیا بدلی ہوئی نظر آئیگی، میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کی چھٹیوں تک اس ملک میں کیا تغیرات ہو جائیں گے، اگر آپ نے اپنے گرد و پیش کی دنیا کا جائزہ نہ لیا، تو آپ اس دنیا میں خود بیگانہ بن جائیں گے۔

اندرونی خطرہ

بڑے خطرے کی بات یہ ہے کہ خود مسلمانوں کے اندر ایک جماعت ایسی پیدا ہوگئی ہے، جو غیر مسلموں کے مقابلہ میں "مدعی سست گواہ چست" کی مصداق ہے، وہ اگر کوئی بات ادھ کہی، اور دبی زبان سے کہتے ہیں تو یہ اسکو ڈنکے کی چوٹ پر کہنے کیلئے تیار ہیں وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہاں کی مشترک تہذیب میں ضم ہو جانا چاہیئے اور تمام امتیازات یہاں تک کہ عربی، اسلامی ناموں سے بھی چینی مسلمانوں کیطرح دست بردار ہو جانا چاہیئے، وہ صاف کہتے ہیں کہ اگر ہم کو ہندوستان میں رہنا ہے تو ہر اس چیز سے دست بردار ہونا پڑیگا جس میں "من وتو" کی تمیز پیدا ہوتی ہے اور جو مسجد وکلیسا میں امتیاز پیدا کرتی ہے، اس وقت جو ذہن ہندوستان کی قیادت کر رہا ہے، وہ ہر اس چیز سے بھڑکتا ہے، جو کسی قسم کا امتیاز، اور تشخص پیدا کرتی ہے۔

تعیّن و وضاحت اسلام کا امتیاز

لیکن ہمارے دین کے حدود معین ہیں، ہمارے دین کے اس "اکال الامم" سرزمین میں اپنی جداگانہ شکل وصورت کے ساتھ باقی رہنے کا راز اسی میں مضمر ہے کہ اس میں آریائی مذاہب کی طرح اطلاقیت، یا تعینات سے گریز، اور رقّت و سیالیت نہیں ہے جس نے ہمہ وست کے عقیدہ، یا وحدۃ ادیان کے فلسفہ کو جنم دیا، ہمارے

یہاں کفر و ایمان، شرک و توحید، ضلالت و ہدایت، اور حلال و حرام کے درمیان واضح طریقہ پر خط کھینچا ہوا ہے۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (سورۃ البقرہ ۲۵۶)۔	تو جو شخص سرکش سے اعتقاد نہ رکھے اور خدا پر ایمان لائے اس نے ایسی مضبوط رسی ہاتھ میں پکڑ لی ہے وہ کبھی ٹوٹنے والی نہیں ہے

وحدت ادیان نہیں، وحدت حق۔

وہ وحدت ادیان کا نہیں، بلکہ وحدت حق کا قائل ہے، یعنی سب دین ایک نہیں، بلکہ حق ایک ہے، وہ صاف اعلان کرتا ہے:۔

فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (سورۃ یونس ۳۲)	اور حق بات کے ظاہر ہونے کے بعد گمراہی کے سوا ہے ہی کیا، تو تم کہاں پھرے جاتے ہو۔

اس کا ایک واضح اور معین نظام عقائد ہے، اسکی ایک مستقل تہذیب ہے۔ مکمل قانون اور نظام معاشرت ہے، اس کے لئے اس کے صحیفہ میں صاف اعلان موجود ہے کہ:۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (سورۃ مائدہ ۳)	آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا۔

یہاں نہ کوئی اپنے آپ کو دھوکا دے سکتا ہے، نہ دوسرے کو، یہاں دن کی روشنی ہے

جس میں سپید و سیاہ صاف نظر آتے ہیں۔

دو حقیقت بیں آنکھیں۔

عزیزو! مولانا محمد قاسم صاحب بانیٔ دار العلوم اور مولانا محمد علی صاحب مونگیری بانیٔ ندوۃ العلماء کو کس چیز نے تڑپایا؟ ایک کو یہاں، اور دوسرے کو وہاں، میں ان دونوں میں کچھ فرق نہیں سمجھتا، میں انکو ایک ہی چہرۂ زیبا کی دو آنکھوں کی طرح سمجھتا ہوں دونوں روشن، دونوں پاکباز اور حقیقت بیں، ایک ہی نور باطن اور ایک ہی فراست ایمانی دونوں کام کر رہی تھی، دونوں ہی "اتقوا فراسۃ المؤمن فانہ ینظر بنور اللہ" کا مصداق تھے، دونوں تعلیمی مرکزوں میں نصاب ایک وسیلہ تھا، مقصد نہیں، اس کے اختلافات بنیادی حیثیت نہیں رکھتے، مولانا محمد علی مونگیریؒ اور ان کے رفقاء کی تحریریں پڑھئے انکی نگاہ ان جزئیات سے بہت بلند تھی، اگر کوئی یہ سمجھے کہ انھوں نے عربی ادب کو غالب کرنے کیلئے، یا تاریخ اسلام اور علوم عصریہ کو جگہ دینے کیلئے ندوۃ العلماء کی تحریک شروع کی تھی، تو اس سے بڑھ کر کوئی حق تلفی ان کے ساتھ نہیں ہو سکتی دونوں نے اپنے اپنے زمانہ کے فتنہ کا مقابلہ کیا ایک نے یہاں قلعہ تعمیر کیا، دوسرے نے وہاں، دونوں نے اپنے اپنے زمانہ کے چیلنج کو قبول کیا، اور بدلے ہوئے زمانہ کے مطابق دین کے محافظ، حق کے داعی اور شریعت کے ترجمان پیدا کرنے کی کوشش کی، خدا ان دونوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب سے سرفراز فرمائے، اور ان کے تمام رفقاء اور معاونین کو

جزائے خیر دے، اور ہمیں ان کے صحیح مقاصد کے سمجھنے، اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اصلاح و تجدید کی تاریخ میں افراد کا مقام اور کام

میرے عزیزو! اسلام میں تجدید و اصلاح کی پوری تاریخ، افراد کی اولوالعزمی کی تاریخ ہے، کہنے کو یہ ملی اور اجتماعی تاریخ ہے، اور بیشک ہے لیکن عملاً یہ از اول تا آخر افراد کی صلاحیتوں ان کے عزم و ہمت کی نمود ہے، جب کبھی اسلام کیلئے موت و حیات کی کوئی کشمکش پیش آئی جب کسی طرف سے دین اسلام کو للکارا گیا، تو کوئی فرد کامل، کوئی صاحب عزم ہستی سامنے آ گئی ایسی موقع پر نہ کوئی کونسل بیٹھتی تھی، نہ کوئی مشورہ ہوتا تھا، کوئی صاحب یقین سامنے آجاتا تھا، اور حالات کو یکسر بدل کر رکھ دیتا تھا، حضرت عمر ابن عبدالعزیز، اور سید نا حسن بصری سے لے کر خاندان ولی اللٰہی اور ان دینی مرکزوں کے بانیوں اور موجودہ دینی دعوتوں اور کوششوں کے علمبرداروں تک سب کا معاملہ یہی ہے کہ ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

مجدد صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب کا کارنامہ

اقبال نے حضرت مجدد الف ثانی کے متعلق بالکل صحیح کہا تھا ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

انھیں کی کوششیں تھیں کہ ہندوستان کا رشتہ دین حجازی اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کٹنے نہیں پایا، اور وہ تہذیبی لحاظ سے برہمنیت، اور فکری واعتقادی لحاظ سے ویدانت کے آغوش میں جانے کے بجائے اسلام و شریعت محمدیؐ کی تحویل اور امانت میں رہا، انھیں کا مخفی ہاتھ تھا، جس نے اکبر کے تخت پر بالآخر محی الدین اورنگ زیب جیسے غیور اور فقیہ بادشاہ کو بٹھایا، پھر اس ملک میں تجدید واحیاء دین کا جو کچھ کام ہوا، وہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے خاندان کا کارنامہ ہے، کیا دیوبند یا سہارنپور، کیا دہلی، کیا لکھنو ہم سب انھیں کے خوان نعمت کے ریزہ چین ہیں، دارالعلوم، مظاہر علوم اور ندوہ اور کتاب وسنت کی تعلیم کی سب درسگاہیں[1]، اسی ایک چراغ سے روشن کئے ہوئے ہیں، ان سب کا سلسلۂ نسب شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے اخلاف نامدار، اور ان کے تلامذۂ باکمال پر ختم ہوتا ہے ؎

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

دیوبند کے طلبہ کی ذمہ داری

آپ اس مدرسہ میں تعلیم پا رہے ہیں، اس مدرسہ کا آپ سے مطالبہ ہے کہ آپ

---

[1] مثلاً جماعت اہل حدیث کے مدارس، جو بنارس، دربھنگہ، مئو وغیرہ میں قائم ہیں۔

اس نئے چیلنج کو قبول کریں، یہاں اگر کوئی آئے تو یہاں اسکو کوئی ہل چل نظر نہیں آئیگی لیکن اس کی تہہ میں طوفان سوئے ہوئے ہیں، اب بھی اگر کوئی موج ایسی اٹھ سکتی ہے، جو الحاد اور بے دینی کے مرکزوں کو متزلزل کر سکتی ہے، تو اسی بحر الکاہل سے ؎

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موج تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہہ و بالا

نازک ترین دور

میں تاریخ کا ایک طالب علم ہوں، اور تاریخ میرا ایک پسندیدہ اور محبوب موضوع ہے، میرا ہندوستان کی تاریخ کا جتنا مطالعہ ہے، اس کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی ہزار سالہ تاریخ میں اس سے زیادہ نازک دور نہیں آیا، اس لئے کہ اس دور میں حالات کو بدلنے، قلب و دماغ کو متاثر کرنے، ارادوں کو فنا کرنے، جذبات کو ختم کرنے، اقدار کو تبدیل کرنے، اور نقطۂ نظر، و طریقۂ فکر میں انقلاب لانے کے اتنے وسائل کسی دور میں نہیں تھے، پہلے جو دور گذرے ہیں، ان کے پاس کیا سامان تھا؟ کیا سیاست کی یہ شیرینی اور چاشنی تھی؟ جمہوریت اور مساوات کا یہ نعرہ تھا؟ اخبارات، رسائل، پریس، ریڈیو، اور ٹیلی ویژن کی یہ طاقت تھی؟ یہ عظیم دانش گاہیں جغادری یونیورسٹیاں اور کالج تھے؟ جلسے اور جلوس اور پروپگنڈے کی یہ مہارت تھی؟۔

زمانہ کے ابوالفضل و فیضی

گذشتہ دور کا سب سے بڑا فتنہ، فتنۂ اکبری کہا جاتا ہے، کیا اس وقت اقتدار اعلیٰ کے پاس یہ علمی مراکز تھے؟ یہ لاکھوں کی تعداد میں شائع ہونیوالے اخبارات تھے؟ یہ نئی ایجادات تھیں؟ جو مشرق کی بات کو دم کے دم میں مغرب تک پہونچا دیتی ہیں؟ بیشک اکبر کے پاس فیضی اور ابوالفضل جیسے ذہین اور باکمال لوگ تھے، میں ابوالفضل فیضی کی ذہانت کا قائل ہی نہیں، بلکہ اس سے مرعوب ہوں، لیکن آج کتنے ابوالفضل و فیضی موجود ہیں، اس وقت وہ تنہا تھے، آج ان کے کام کے لئے مستقل ادارے قائم ہیں، ابوالفضل فیضی کے اندر کبھی دینی جذبہ انگڑائی لیتا ہوگا، چنانچہ فیضی ہی کے قلم سے "سواطع الالہام" جیسی حیرت انگیز تفسیر نکلی، لیکن آج کے ابوالفضل فیضی کے اندر وہ انابت بھی نہیں جو اس دور کے لوگوں میں تھی، اسلام کے ساتھ وہ جذباتی وابستگی بھی نہیں، جو اس زمانہ کے روشن خیالوں، اور تجدد پسندوں کے اندر تھی۔

الحاد و تشکیک کے نئے دروازے۔

دوستو! فلسفہ اور علم کلام آج اپنی بہت کچھ طاقت کھو چکا ہے سائنس میں بھی اب پڑھے لکھوں کو ملحد، متشکک، اور منکر خدا بنانے کی وہ طاقت نہیں ہے، جو انیسویں صدی کے اواخر، اور بیسویں صدی کے بالکل اوائل میں تھی، اب اس کو اس مقصد سے

کوئی دلچسپی نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر اس کے بہت سے علمبرداروں کے تغیر حال کی وجہ سے دینی حقائق اور خدا، اور عالم غیب کے وجود و ثبوت کے لئے نیا مواد اور نئے دلائل پیدا ہو گئے ہیں، چنانچہ آج فلسفہ و سائنس سے وہ الحاد، اور تشکک نہیں پیدا ہو رہا ہے، جس نے انیسویں صدی کے علماء حق کو مضطرب اور بے قرار بنا دیا تھا، آج اس کے برخلاف سیاسیات و معاشیات اور تاریخ و ادب سے الحاد و تشکیک کا کام لیا جا رہا ہے۔ علوم عمرانیہ (سوشیالوجی) اور انگریزی ادب کے ذریعہ مذہب بیزاری، اور ذہنی انتشار پیدا کیا جاتا ہے، آپکے لئے شاید ایک حیرت انگیز انکشاف ہوگا، کہ آج بہت سی یونیورسٹیوں کے عربی و اردو کے شعبے الحاد و تشکیک کے مرکز بنے ہوئے ہیں، اور شاید بعض یونیورسٹیوں میں عربی مطالعہ اسلامیات کا شعبہ دینی حیثیت سے سب سے زیادہ کمزور ہے۔

حقیقت پسندانہ جائزہ اور وسیع تیاری۔

ہم کو اس صورت حال کا وسیع النظری، وسیع القلبی اور حقیقت پسندی کیساتھ جائزہ لینا چاہئے، اور دیکھنا چاہئے کہ ہم کو زندگی کے میدان میں اترنے اور اسلامی دعوت اور شریعتِ اسلامی کی حفاظت کا مقدس فریضہ اپنے ذمہ لینے سے پہلے کیا کیا تیاریاں کرنی چاہئے؟ اور کن جدید اسلحہ سے مسلح، اور کن جدید طریقہ ہائے جنگ سے واقف اور ان میں ماہر ہونا چاہئے؟

آپ کے لئے تقدیر الٰہی نے اس زمانہ کا انتخاب کیا ہے، سب سے پہلے آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ کس زمانہ کیلئے پیدا کئے گئے ہیں؟ یہ بات قابل فکر بھی ہے، قابل تعریف بھی، ہمدردی کی مستحق بھی ہے، اور مبارکباد کی بھی، مبارکباد کی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا اہل سمجھا، اور اتنی جلیل القدر خدمت آپ کے سپرد کی آپ اس ذمہ داری کو قبول کیجئے، وقت کے اس خطرے، اور زمانہ کی اس سنگینی کو سمجھئے اور اسکی دعا کیجئے، اور خدا سے توفیق مانگئے کہ جس طرح آپ کے اسلاف کرام نے اپنے زمانہ کے بدعات و تحریفات اور اپنے زمانہ کے فتنوں اور ضلالتوں کو قبول نہیں کیا آپ اس وقت کی بدعات و تحریفات اور اس دور کے فتنوں اور ضلالتوں اور جاہلیتوں کو قبول نہ کریں۔

مذہب کا مغربی تصور اور اس کا فتنہ۔

آپ اس چیلنج کو قبول کریں جو مذہب کو ہر قسم کے اثر و رہنمائی سے، اور زندگی میں مداخلت کرنے سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیتا ہے، مذہب بیزار یورپ کے اس مسلمہ اصول پر اعتقاد رکھتا ہے کہ مذہب ایک پرائیویٹ معاملہ ہے، جو ہر قسم کے آزاد نظام تعلیم آزاد تعلیم گاہوں، اور مکمل وہمہ گیر تہذیب کے نظریہ کا مخالف ہے اور جس کے بعد ہندوستان کی صورت حال وہی ہو جائے گی جس کو اقبال نے نصف صدی پہلے کہدیا تھا ؎

ملا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

دیوبند کے فضلاء کتنے مؤثر اور کامیاب ہو سکتے ہیں؟

صرف دارالعلوم دیوبند کے فضلاء اگر عزم کرلیں، اور توفیق الہٰی ان کی دستگیری کرے تو اس صورت حال میں بہت کچھ تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں، ان کا جمہور و عوام سے جو ربط ہے، وہ کسی دینی جماعت کا نہیں، ان کے سارے ہندوستان میں مدارس کا جن کو ہم مدارس عربیہ کہتے ہیں، جال بچھا ہوا ہے، اور اس درسگاہ کے علماء و فضلاء وہاں مسندِ درس پر متمکن، عام مسلمانوں میں "ذی اعتبار" اور مساجد و محلوں میں با اثر ہیں لیکن اس کیلئے ایک ایسی قلندرانہ جرأت اور ایک ایسے مستانہ یقین کی ضرورت ہے جس کو دیکھ کر ترجمان حقیقت شاعر پکار اٹھے ؂

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جسکو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

ذہن و کردار کی تعمیر

ان نئے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے آپ کو ذہنی طور پر بھی تیار ہونا پڑیگا اور علمی طور پر بھی اور اخلاقی و روحانی طور پر بھی، ایک طرف آپ کو جدید فتنوں اور فلسفوں

کی حقیقت نما ہیئت کا پس منظر ان کے محرکات اور عوامل، اور ان کے ارتقاء کی تاریخ کا غائر نظر سے مطالعہ کرنا ہوگا کہ اپنے حریف اور مدمقابل کو پوری طرح پہچاننا، اس کی طاقت، اور اس کے مقاصد سے واقف ہونا مقابلہ کیلئے شرط اوّلین ہے، دوسری طرف آپ کو اپنے اندر اتنی پختگی اور صلابت اور اتنی خودداری اور خودشناسی پیدا کرنی ہوگی کہ کوئی آپ سے آپ کے ضمیر کا، آپ کے عقیدہ کا، اور آپ کی دینی حمیت کا سودا کرنے کا خواب بھی نہ دیکھ سکے، موجودہ نظام تعلیم اپنے فضلاء کو ایک کف جو پر بکنا، اور اپنے جوہر و ہنر کا نیلام کرنا سکھاتا ہے، مگر ہمارا نظام تعلیم اس کا قائل ہے کہ:۔

ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

موجودہ عہد کی عام ضمیر فروشی

یہ عام ضمیر فروشی اور دین فروشی کا دور ہے، بڑے بڑے فاضل اور صاحب قلم ہیں۔ جن کی ذہانت، اور جن کے مطالعہ کے سامنے ہماری کوئی حیثیت نہیں، لیکن ضمیر کے نام کی کوئی چیز ان کے یہاں پائی نہیں جاتی، ان کے دماغ کی جگہ پر دماغ ہے اور دل کی جگہ پر بھی دماغ ہی ہے، بلکہ ان کے پہلو میں ایک دھڑکتے ہوئے دل کے بجائے ایک رواں دواں قلم رکھا ہوا ہے، جو سب کچھ لکھ سکتا ہے، جس کے یہاں آخرت کی جوابدہی، اور ضمیر کی ملامت، اور سرزنش کا کوئی سوال نہیں، ان میں زمانہ کے ساتھ

بدلنے، اور اس کے مطالبوں کی ترجمانی کرنے کی غیر محدود صلاحیت ہے۔

نئی قیادت کی ضرورت

آپ یہاں سے مدرس بن کر نکلیں، مبارک، آپ علمی متون کے شارح ہوں، مبارک، آپ واعظ و خطیب ہوں، مبارک، آپ کتابوں کے مصنف ہوں، مبارک میں بھی اس کا گنہگار ہوں، لیکن اس وقت زمانہ کو اس سے زیادہ کسی اور چیز کی ضرورت ہے، اس وقت زمانہ کو ان مردان کار کی ضرورت ہے، جو اس نئے دور کو ایک نئی فکری قیادت، ایک نیا دینی اعتماد، ایک نئی روحانی و اخلاقی قوت عطا کر سکیں اگر ایسا نہ ہوا تو ہندوستانی مسلمانوں کیلئے بڑا خطرہ ہے، اور اس ملک کے لئے بھی، آج زمین ہمارے پاؤں تلے سے نکلتی جا رہی ہے، اور بالکل وہی حال ہے جس کی قرآن مجید نے اپنے معجزانہ الفاظ میں تصویر کھینچی ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا۔ (سورۃ الرعد۔ ۴۱)	اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹائے چلے جاتے ہیں۔
وَضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ (سورۃ التوبہ ۱۱۸)	اور زمین باوجود (اتنی بڑی) فراخی کے ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی جانیں ان پر دو بھر ہو گئیں۔

آج ہم جس زمین پر کھڑے ہوئے ہیں اور جس پر دینی و علمی مرکزوں کے قلعے تعمیر کر رہے ہیں، وہ کوئی پتھر کی چٹان یا مسطح میدان نہیں ہے، وہ ریت کا ایک تودہ ہے جس کے ذرّوں کو ہواؤں کے طوفان اڑا رہے ہیں، اور جو برابر ہمارے نیچے سے کھسک رہی ہے۔ یہ وہی زمین ہے جس کو قرآن مجید نے "کَثِیْبًا مَّھِیْلًا" کہا ہے۔

حقیقت شناسی اور خود شناسی

دوستو! قبل اس کے کہ زمانہ آپ کو سبق دے، زمانہ کے بے درد اور بے رحم حقائق آپ کی آنکھیں کھولیں آپ خود آنکھ کھولنے اور روشنی حاصل کرنے کی کوشش کریں، گرد و پیش کی دنیا کا جائزہ لیں، اور دیکھیں کہ اچانک آپ کو انقلاب روزگار نے کہاں لاکر کھڑا کر دیا ہے، کہاں مولانا محمد قاسمؒ، مولانا محمد علی مونگیریؒ، اور مولانا شبلیؒ کا عہد، اور کہاں آج کا عہد، اگر آپ عزم کے ساتھ اس انداز پر اپنے ذہنوں کی تعمیر کریں، اور اساتذہ کرام رہنمائی فرمائیں، کہ جب آپ اس محدود دنیا سے نکلیں تو آپ اس وسیع دنیا کے (جس میں آپ کو زندگی گذارنا ہے) حقائق سے آنکھیں ملا سکیں، حالات سے پنجہ آزمائی کر سکیں۔

آپ کے اسی گردہ کے اندر ان بوسیدہ کپڑوں، اور نحیف جسموں میں شیر خفتہ ہیں آپ ہی کے اندر ایسے پاک نفس داعی، اور ایسے بے لوث مصلح ہیں، جن سے آپ بھی بے خبر ہیں، اور آپ کے اساتذہ بھی اور آپ کے دوست و رفیق بھی، میں اپنی

خوابیدہ صلاحیتوں کو اپنی اس کمزور اور ناتواں آواز سے دستک دے رہا ہوں، کاش کہ میری آواز ان دروازوں کے پار پہونچ جائے اور سونے والوں میں بیداری پیدا ہو اور آپ اپنی بے کراں صلاحیتوں سے واقف ہوں، اقبال نے ہلالِ عید کو مخاطب کر کے کہا تھا، میں آپ کو مخاطب کر کے کہتا ہوں ؎

برخود نظر کشا ز تہی دامنی مرنج
در سینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیمؕ

مجلس نشریات اسلام

ایک عرصہ سے عالمِ اسلام میں ایسے لٹریچر کی ضرورت شدت سے محسوس کیجارہی ہے جو اسلام کی مؤثر وطاقتور نمائندگی کرے، ایمان ویقین کی بنیادیں ذہن ودماغ میں ازسرِ نو استوار کرے اس ذہنی بے چینی وانتشار کو رفع کرے جو مغرب کی مادہ پرست اور شک آفریں تہذیب وادب نے عالمگیر پیمانہ پر پیدا کردیا ہے۔ اور اس نئے ارتداد کا مقابلہ کرے جو طوفان وسیلاب کی طرح سارے عالم میں پھیل گیا ہے اور اسلام ایک زندہ ومعین مذہب ہونے کی وجہ سے خاص طور پر اس کی زد میں ہے۔ ان حقائق کے احساس اور ان خطرات کے اندازہ نے جو اس خلاء کی وجہ سے عالم اسلام کو بالعموم اور ہمارے برصغیر کو بالخصوص درپیش ہیں، بعض سوچنے والوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ایسی تصنیفی واشاعتی مجلس کی تشکیل کریں جو ہر قسم کی جماعتی سیاسی اور تجارتی اغراض سے بالاتر ہوکر اسلام وانسانیت کی یہ خدمت انجام دے۔ چنانچہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم کے زیرِ صدارت مئی ۱۹۵۹ء میں "مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام" کا قیام دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عمل میں آیا تھا۔ الحمدللہ مجلس نے اپنے قائم ہونے کے بعد سے اس وقت تک کے قلیل عرصہ میں دینی وعلمی حلقوں میں خاصی مقبولیت اور وقعت حاصل کرلی ہے، اس کی شہرت میں برابر اضافہ ہورہا ہے، اسکی مطبوعات کو قدر اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے۔ اور سرعت کے ساتھ اس کی اشاعت ہورہی ہے۔

اب الحمدللہ مولانا علی میاں مدظلہٗ کی تحریری اجازت سے مجلس کی تمام مطبوعات کو کراچی میں طبع کرنے کا انتظام "مجلسِ نشریاتِ اسلام K/3-1 ناظم آباد ۱ (کراچی) نے کیا ہے اور اب تک مجلس نے حضرت مولانا علی میاں مدظلہٗ کے تین رسالے۔

۱۔ لسانی و تہذیبی جاہلیت کا المیہ اور اس سے سبق۔

۲۔ عصر جدید کا چیلنج اور اس کا جواب۔

۳۔ NEW MENACE AND ITS ANSWER

شائع کئے ہیں۔ اور اب بڑی کتابوں میں انشاء اللہ سب سے پہلے حضرت مولانا مدظلہٗ کی "نقوشِ اقبال" جو ڈاکٹر اقبال کے فکر و کلام کو اسلامی پیغام کی روشنی میں سمجھنے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ نیز اقبال کی شخصیت کے تخلیقی عناصر کی نشاندہی کرتی ہے طبع ہو کر آجائے گی۔ اور پھر سلسلہ وار حضرت مولانا مدظلہٗ کی تمام تصانیف طبع کی جائیں گی۔

فضل ربی ندوی
ناظم مجلس